© rasailojaraid.com

جناب محمد خالد مسعود

تحقیقاتِ اسلامی میں اصولِ فقہ کی اہمیت

ہمارے یہاں درس و تدریس اور تحقیقات میں اصولِ فقہ کو مناسب اہمیت نہیں دی جاتی۔ دینی مدارس میں تو پھر بھی ان کی چند کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ لیکن اسلامی علوم و تحقیقات کے جدید اداروں، یونیورسٹی میں علومِ اسلامیہ کے شعبوں اور اسلامی قانون کی تدریس اور تحقیقات میں اس کو وہ مقام نہیں دیا جاتا ہے جس کا یہ مضمون مستحق ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ہم اس سے بحث کریں گے کہ اسلامی علوم کی تدریس میں اصولِ فقہ کے مطالعہ کی کیا افادیت ہے اور اسلامی موضوعات پر تحقیقات کے ضمن میں اصولِ فقہ کتنا اہم کردار ادا کرتا ہے۔

بحث کے آغاز سے قبل اس کی ضرورت ہے کہ دو بنیادی اصطلاحات کی وضاحت کر لی جائے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ بات ابہام کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ موضوعِ بحث میں دو اصطلاحات وضاحت طلب ہیں: تحقیقاتِ اسلامی اور اصولِ فقہ۔

تحقیقاتِ اسلامی کی اصطلاح اس مضمون میں وسیع تر اور جامع مفہوم میں استعمال کی گئی ہے۔ اس میں اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس اور تحقیقات سبھی شامل ہیں۔ مختلف اداروں، جامعات اور انفرادی سطح پر اسلامی علوم کے بارے میں جو کام کیے جا رہے ہیں ان کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔

موضوعات کے اعتبار سے اسلامی علوم میں اسلام کی تاریخ، فلسفہ، کلام، ثقافت منطق، لغت اور فقہ وغیرہ سبھی آتے ہیں۔ تحقیقاتِ اسلامی کو اتنے جامع مفہوم میں استعمال کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اصولِ فقہ کی اہمیت و افادیت کی ہمہ گیری اور وسعت کو واضح طور پر بیان کیا جا سکے۔

اصولِ فقہ کی اصطلاح خاص طور پر وضاحت طلب ہے۔ عام طور پر اسے مرکبِ اضافی سمجھ کر اس کو فقہ کے ماخذ کے علم تک محدود کر لیا جاتا ہے اور یہ ماخذ بھی چار یعنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن، سنت، اجماع، قیاس سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ اصولِ فقہ سے عام طور پر ذہن میں یہی چار ماخذ آتے ہیں۔

اصولِ فقہ کی جو تعریف عام طور پر کی جاتی ہے وہ دو طرح پر ہے۔ ایک اضافی یعنی اصولِ فقہ کو مرکبِ اضافی شمار کرتے ہوئے اور دوسرے لقبی یعنی ایک مخصوص علم کے نام کی حیثیت سے۔ اضافی لحاظ سے اصولِ فقہ کے الگ الگ معنی لیے جاتے ہیں۔ یعنی فقہ کے اِدلّہ۔ اور فقہ سے مراد تفصیلی اِدلّہ کی بنیادوں پر استدلال کے ذریعے شرعی فرعی احکام کا علم ہے۔ لقبی اعتبار سے اصولِ فقہ ان قواعد کے علم کا نام ہے جن سے تفصیلی اِدلّہ (ثبوت) کے ساتھ فرعی احکامِ شرعیہ کا استنباط کیا جا سکے۔

یہ تعریفیں اپنی جگہ صحیح ہیں، لیکن ان سے اصولِ فقہ کی کتابوں میں موجود ان بیش بہا خزانوں کی نشاندہی نہیں ہو پاتی جو سالہا سال تک اور مختلف تاریخی اور معاشرتی عوامل کے نتیجے میں جمع ہوتے رہے ہیں۔ در اصل یہ تعریفیں قدیم یونانی منطق کی تعریف کے ضابطوں پر تو پوری اُترتی ہیں، لیکن اصول فقہ کے علم کی نشو و نما جن حالات میں ہوئی ہے اور جن مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے یہ علم پروان چڑھا ہے، اس کے لیے تحلیلی کے بجائے "تاریخی" اور "بیانی" طریق تعریف زیادہ بہتر ہوگا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو متداول تعریفات سے اصولِ فقہ، علمِ لغت، یا علمِ منطق کی کوئی شاخ معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ اصولِ فقہ میں لغوی، منطقی، کلامی، سبھی مباحث آتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ درحقیقت مقاصدِ شرعیہ کا علم ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ اصولِ فقہ ایسا علم ہے جو ان رہنما اصولوں کے حصول، حجیت اور اطلاق سے بحث کرتا ہے، جو ایک مفتی اور مجتہد کے لیے فقہی مسائل کو مقاصدِ شرعیہ کی روشنی میں حل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ امام شاطبی نے "الاعتصام" میں انہی امور کو سامنے رکھتے ہوئے اصولِ فقہ کی تعریف یوں کی ہے:

واصول الفقه انما معناها استقراء كليات الادلة حتى تكون عند المجتهد نعب عين وعند الطالب سهلة الملتمس۔

اصولِ فقہ کے معنی ہیں ادلہ (شرعیہ) کے کلیات کا استقرا تاکہ وہ مجتہد کے لیے رہنما ہو اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مستفتی کے لیے مقصود میں سہولت کا باعث ہو۔

تحقیقاتِ اسلامی میں اصولِ فقہ کی اہمیت کے کئی پہلو ہیں لیکن ہم ان میں سے صرف چار پہلوؤں سے بحث کریں گے۔

غور کیا جائے تو اکثر اسلامی علوم کے رابطے یا متوازیات دوسرے مذاہب اور ثقافتوں میں مل جاتے ہیں۔ فلسفہ، منطق اور علم الکلام کی صورت تو واضح ہے، لیکن یہی بات کسی حد تک علوم نقلیہ کے بارے میں بھی کہی جاتی ہے۔ تصوّف کے بارے میں ابھی تک یہ بحث جاری ہے کہ اسلام میں اس کا ورود بیرونی اثرات کا نتیجہ ہے یا اس کا منبع خود قرآن کریم ہے۔ لیکن اصولِ فقہ کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ اول و آخر ایسا علم ہے جس کا آغاز اسلام سے ہوا اور اس کی نشو و نما اسلامی معاشرے کی ضروریات اور مقتضیات کے زیرِ اثر ہوئی۔ اس کے موضوعات، طرزِ فکر اور طرزِ تحقیق سب اسلامی ماحول میں تشکیل پائے ہیں۔ یہ کلیتہً اسلامی ذہن کی پیداوار ہے اور اس لحاظ سے اسلامی فکر و ثقافت کی علامت ہے۔ بعض مستشرقین نے اس کے ڈانڈے یہودی ضوابط اور قانونِ روما سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن دراصل وہ اس نتیجے پر منطقی طرزِ استدلال کی جزوی مماثلت کی بنیاد پر پہنچے ہیں۔ یہ نتائج اس لحاظ سے قابلِ اعتبار نہیں کہ سلطنتِ روما کے قانون، تالمود اور شریعتِ اسلامی میں قانون کے تصورات و مبادیات میں کوئی مماثلت نہیں۔ اور پھر ان تینوں کی نشو و ارتقا بالکل مختلف ماحول میں ہوئی ہے۔ جب یہ حقیقت ہے تو جزوی مماثلت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جو بات اہم اور قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ روما کے قانون دان ہوں یا علمائے تالمود، کسی کے ہاں بھی اصولِ فقہ کی طرح کوئی علم الگ سے موجود نہیں رہا۔ اس وضاحت کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ اتنے اہم علم کو ہمارے نصابِ تدریس میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ اہلِ تشیع کے ہاں اصول الفقہ پر توجہ رہی ہے اور مسلسل کام ہوتا رہا ہے لیکن اہلِ سنت کے ہاں اس کی نشو و نما بہت عرصہ ہوا رک گئی اور اس کے بعد اس کے درس و تدریس کی طرف بھی توجہ کم ہوتی گئی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ماضی قریب میں جب غیر ملکی استعمار نے مسلمان ملکوں میں قدم جمائے تو عدالتی نظام میں مسلمانوں کے شخصی قوانین کے سلسلے میں انھیں اسلامی فقہ سے شناسائی کی ضرورت پڑی۔ اس کے لیے فقہ کی امہاتِ کتب کے ترجمے کیے گئے۔ ان کتابوں کے سمجھنے کے لیے اصول فقہ کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ اصول فقہ کی طرف بھی توجہ دی گئی لیکن بدقسمتی سے اس موضوع کو نہایت سرسری طور پر لیا گیا اور اصولِ فقہ کے اصل متن کے ترجمے کی جگہ کوشش یہ کی گئی کہ اصول فقہ پر انگریزی میں براہِ راست کتابیں لکھی جائیں۔ اس سے بات اور زیادہ پیچیدہ ہوتی گئی۔ اس پیچیدگی کے پس منظر میں ایک تو استعماری حکومت کے مفادات تھے اور دوسرے غیر مسلم اہلِ علم کے ذہنوں میں اسلام کے غیر ترقی یافتہ ہونے کا مفروضہ جما ہوا تھا۔ اس کی بنا پر اسلامی قانون کے بارے میں ان کے ہاں غلط تصورات قائم ہو چکے تھے۔ وہ اسے ایک طرف تو صحیح معنوں میں قانون ہی نہیں مانتے تھے اور دوسری طرف اصطلاحات کی مماثلت، یہودی قانون کے چند الفاظ اور اس طرح کے ناکافی دلائل کی بنا پر اسلامی قانون کو ایک مخصوص قوم کے مذہبی ضابطۂ حیات یا ضابطۂ اخلاقیات سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے تھے۔ ان تصورات کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ اور اصولِ فقہ کی اصطلاحات میں تمیز اُن کے لیے ہمیشہ مشکل رہی۔ فقہ کو "لا" تو نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس لیے اسے "جیورس پروڈنس" کا نام دے دیا۔ اور اصول فقہ کو "پرنسپیا لوجی" "پرنسپلز آف اسلامک جیورس پروڈنس" اور "روٹس یا سورسز آف اسلامک لا" وغیرہ مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا۔ چونکہ اصولِ فقہ سے ان کا تعارف اس لفظ کے لغوی معنوں اور چند ابتدائی کتابوں تک محدود تھا، اس لیے اس کے موضوعات وغیرہ کا کوئی جامع تصور ان کے ذہن میں جگہ نہیں پا سکا۔

اگر یہ بات مستشرقین تک محدود رہتی تو شاید علم کی دنیا کو اتنا بڑا نقصان نہ ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے یہاں قانون کی تعلیم پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا۔ اصولِ فقہ نصاب قانون میں تو شامل کر لیا گیا۔ لیکن عربی زبان سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اصولِ فقہ کے اصل متون تک دسترس نہیں تھی۔ چنانچہ انگریزی میں لکھی ہوئی کتابوں پر انحصار کیا گیا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے بھی مختصر، مطول اور حواشی نکل آئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے وکلا اور قانون دان اسلامی قانون کے اہم ترین علم سے کماحقہٗ استفادہ نہیں کر سکے۔ ان کے ذہنوں میں اصولِ فقہ سے مراد، چار مآخذ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس ہیں۔ کبھی ضرورت پڑے تو "استحسان" کا حوالہ بھی دے دیتے ہیں اور بابِ اجتہاد کے کھلا رکھنے کی وکالت بھی کرتے ہیں۔ لیکن "اصولِ فقہ" اپنے جامع مفہوم میں ان کے ہاں جگہ نہیں پا سکا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے نصابِ قانون میں اصول فقہ کو کماحقہٗ اہمیت دی جائے اور اس کا اتنا ہی گہرا مطالعہ کرایا جائے جتنا انگلش یا امریکن جیورس پروڈنس کا کرایا جاتا ہے، تو ہمارے ہاں اسلامی قانون کی نشأۃ ثانیہ اسمبلی ہال کے علاوہ عدالتوں سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس امر کی ضرورت ہے کہ اصولِ فقہ کی اہم کتابوں کے ترجمے اردو اور انگریزی میں کیے جائیں اور ان کتابوں کی روشنی میں نئے انداز سے اصولِ فقہ پر بہت سی نصاب کی کتابیں تیار کی جائیں۔ اس بارے میں گزشتہ چند سالوں میں عربی زبان میں اصولِ فقہ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

تحقیقاتِ اسلامی میں اصولِ فقہ کی اہمیت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں اصولِ فقہ ایک اسلامی منہجِ تحقیق کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ جب اسلامی معاشرے کو نئی ثقافتوں، نئے حالات اور نئے معاشروں کا سامنا ہوا تو کئی مسائل ابھرے۔ اس وقت فقہا کے سامنے یہ سوال بھی آیا کہ ایک ایسا طریق کار وضع کیا جائے، جس کے ذریعے ان مسائل کو اسلامی انداز سے حل کیا جا سکے۔ انھوں نے اپنی گزشتہ تاریخ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے اسوہ پر نظر ڈالی تو کئی واقعات میں رہنمائی ملی۔ صحابہ کے ہاں استدلال کے مختلف طریقے موجود تھے۔ ابن مسعود کے نزدیک ہر مسئلے کا حل قرآن سے اخذ کیا جا سکتا تھا کیونکہ ان کے نزدیک رسول اللہ کے اقوال و افعال بھی قرآن کا حصہ اور تفسیر تھے۔ تابعین میں سے بعض اس بات پر زور دیتے کہ مدینہ، رسول اللہ اور ان کے اصحاب کا شہر تھا۔ اس لیے یہاں کے لوگوں کا کسی عمل پر تواتر اور اتفاق اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بات کی ضمانت ہے کہ اسے رسول اللہ کی سنت کی تائید حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ فقہا نے ان مختلف طرز ہائے فکر میں مشترک بات جو پائی وہ یہ تھی کہ کسی حل کے اسلامی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ماخذ اس کا اولاً قرآنِ کریم ہو۔ پھر سنتِ نبوی ہو، پھر صحابۂ رسول کا اس پر اتفاق ہو۔ اور اگر ان میں سے کسی ماخذ میں رہنمائی نہ ملے تو پھر رائے سے مدد لی جا سکتی ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ سارے ماخذ قرآنِ کریم کا تسلسل اور امتداد تھے۔ اس لیے انھوں نے ان کے لیے ایک جامع اصطلاح "بیان" کی استعمال کی۔ البتہ امام شافعی نے "رائے" کی اصطلاح کی تحدید کی اور "قیاس" کی اصطلاح کو انھی معنوں میں متعارف کرایا۔ یہاں اصولِ فقہ کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں، تاہم اس بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ اصولِ فقہ کا آغاز امام شافعی کے "الرسالہ" سے اچانک نہیں ہوا۔ لازماً اس سے قبل بھی اس پر کچھ نہ کچھ سوچا گیا ہوگا، لکھا گیا ہوگا۔ لیکن اصول الفقہ کی طرف توجہ کی کمی کی وجہ سے امام شافعی سے قبل کے دور پر اور اس کے بعد کے دور پر بھی کوئی تحقیق نہیں ہوئی۔ مستشرقین کی تحقیقات خاطر خواہ نہیں کیونکہ یہ اکثر قیاسات اور لغوی استنباط پر مبنی ہیں، حقائق پر نہیں۔ جب تک تحریری مواد حاصل نہیں ہوتا ہم کیسے اس دور کے بارے میں کوئی حتمی بات کہہ سکتے ہیں

اس کے علاوہ اصولِ فقہ کی تاریخ لکھتے ہوئے عام طور پر اس امکان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، کہ یہ ضروری نہیں کہ اصولِ فقہ کا ڈھانچا جو امام شافعی نے پیش کیا تھا وہی حتمی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ اور طرز ہائے تحقیق بھی مروّج رہے ہوں۔ مثلاً اصولِ فقہ پر امام ابو یوسفؒ کے ایک رسالے کا ذکر ملتا ہے۔ اگرچہ رسالہ دست یاب نہیں ہے لیکن امکان یہ ہے کہ ان کے یہاں اصول فقہ کا طرز دوسرا ہوگا۔ اس امکان کی بنیاد دو شواہد پر ہے۔ ایک تو یہ کہ امام شافعی کے کوئی دو سو سال بعد بھی ہمیں امام سرخسیؒ شوافع سے اختلاف کرتے ملتے ہیں کہ شوافع نے محض مرفوع احادیث کے قابلِ استدلال ہونے پر زور دینے کی وجہ سے کئی مرسل احادیث کی اہمیت کم کر دی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفیہ کے ہاں اصولِ فقہ کی نشو و نما یقیناً شوافع سے مختلف رہی ہے۔ اس کی مزید تائید ابن خلدون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ہاں ملتی ہے جس نے اصولِ فقہ میں دو طرز ہائے تدوین کا ذکر کیا ہے۔ ایک طرزِ متکلمین اور دوسرا قواعدِ حنفیہ۔ یہاں تفصیل میں گئے بغیر ہم یہ عرض کریں گے کہ متکلمین کو اصولِ فقہ میں اپنی دلچسپی کے موضوعات ملے تو انھوں نے اس علم میں تصنیفات شروع کر دیں۔ ان کے منطقی طرزِ استدلال نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی اور آخر ساتویں صدی ہجری میں اصولِ فقہ پر علمِ کلام کی چھاپ بہت گہری ہو گئی۔ اتفاق سے متکلمین میں دوسرے طبقے کے لوگ فقہی مسلک کے اعتبار سے اکثر شوافع تھے، اس لیے جب متکلمین کا طرز مقبول ہوا تو شافعی اصولِ فقہ پر غالب آگئے اور اس کا لازمی اثر حنفی اصولِ فقہ پر بھی پڑا۔ ہم اکثر متاخرین کی کتابوں کے مطالعے کے بعد متقدمین کی طرف جانے کے عادی ہیں، اس لیے ان اثرات کا احساس کم ہوتا ہے۔ اب ضروری ہے کہ متقدمین کی کتابوں کا مطالعہ زیادہ سے زیادہ ہو اور ان عوامل و اثرات کا مطالعہ و تجزیہ کیا جائے جو مختلف مکاتبِ فقہ کے تعامل سے اس علم کی نشو و نما میں مفید ثابت ہوئے۔

اصولِ فقہ کی اہمیت محض فقہی منہجِ تحقیق کی حد تک نہیں بلکہ دوسرے اسلامی علوم حتّٰی کہ اسلامی فکر پر بھی اس کی گہری چھاپ ہے۔ دوسرے علوم میں طرز ہائے استدلال اور فکری ڈھانچے، تصورات، اصطلاحات، حتّٰی کہ موضوعات تک پر اس کا اثر ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے اصولِ فقہ کا مطالعہ تمام اسلامی علوم نقلیہ یا عقلیہ کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے۔ یہ تحقیقاتِ اسلامی میں اصولِ فقہ کی اہمیت کا تیسرا پہلو ہے۔

اس کے مشاہدات ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ حال ہی میں امریکہ کے ایک عیسائی عرب فلسفی جارج فضلو حورانی نے معتزلہ کے علمِ اخلاق پر ایک تحقیق پیش کی ہے۔ وہ قاضی عبدالجبار معتزلی کے علم الاخلاق پر بحث کرتے ہوئے، اس سلسلے میں مستشرقین کو جو دقتیں پیش آتی ہیں اور جن کی بنا پر وہ اسلامی علم الاخلاق کے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہیں، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اپنے دیباچے میں لکھتا ہے کہ:

"ONE REASON WHY MEDIEVAL ISLAM HAS NOT UPTO NOW BEEN SEEN TO CONTAIN MUCH IN ITS PHILOSOPHICAL ETHICS TO INTEREST

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

US TODAY HAS BEEN THAT WE HAVE NOT KNOWN WHERE TO LOOK."

اس تبصرہ کے بعد وہ بحث کرتا ہے کہ علم اخلاق کے سلسلے میں مغربی علما اکثر فلسفہ اور اخلاقیات کی کتابوں تک محدود رہے ہے۔ حالانکہ :

"THE WRITINGS OF MEDIEVAL ISLAMIC JURISPRUDENCE INCLUDE MUCH THAT IS OF INTEREST FOR ETHICS, ESPECIALLY AT THE POINTS WHERE REVELATION WAS FELT TO BE IN NEED OF EXTENSION OR SUPPLEMENT AS A SOURCE OF LAW."

چنانچہ حورانی نے قاضی عبدالجبار معتزلی کے علم اخلاق کے لیے اس کے اصول فقہ کے مباحث کی طرف خصوصی توجہ دی ہے، خصوصاً حسن و قبح فعل کا مسئلہ، ایجاب و تکلیف کا مسئلہ، احکام خمسہ کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ۔ ان سے اخلاقیات کے مباحث جس طرح نتھر کر سامنے آئے، اس کے نتائج سے وہ خود بھی قدرے متعجب ہے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف اس دور کے بلکہ آج کے دور کے علم اخلاق کے بہت سے مسائل کو سمجھنے میں بے حد مدد ملتی ہے۔

صرف علم اخلاقیات میں ہی نہیں، اصولِ فقہ لسانیات، فلسفہ، منطق جیسے موضوعات میں بھی رہنمائی کر سکتا ہے۔ آج کل فلسفۂ لسانیات میں معنی اور مفہوم کے تعین اور اس کے عمل کے جو مسائل زیر بحث ہیں، ان کا مواد اصولِ فقہ میں بہت زیادہ مل سکتا ہے۔ کیونکہ اصولِ فقہ بھی اس سے بحث کرتا ہے کہ لفظ اور معنی کا کیا رشتہ ہے۔ سیاق و سباق اور فعل و عمل سے کس طرح معنی کا تعین ہوتا ہے۔ معنی اصلی اور تابع میں کیا فرق ہے وغیرہ وغیرہ۔

منطق میں آجکل "ڈی اونٹک لوجک" پر توجہ دی جا رہی ہے۔ اس کا اثر مغرب میں قانونی منطق پر بھی پڑ رہا ہے۔ اصولِ فقہ کی منطق جہاں روایتی ہے وہاں اس کے ساتھ ساتھ اس میں اکثر ایسا مواد بھی ملتا ہے جو "ماڈل لاجک" اور "ڈی اونٹک لاجک" کے مباحث سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصولِ فقہ میں ارادہ اور نیت کے بارے میں تفصیلی مباحث موجود ہیں، جن میں نفسیاتی امور بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔ آج کے فلسفۂ قانون اور نفسیات میں انسانی ارادہ کے متعلق جو تحقیقات ہو رہی ہے، اس میں اصولِ فقہ کے یہ مباحث کافی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہاں تمام امکانات کا احاطہ مقصود نہیں لیکن ان مختصر اشارات سے یہ بات ضرور سامنے آجاتی ہے کہ اصولِ فقہ پر تحقیقات سے نہ صرف اسلامی علوم کو بہتر طریقے سے سمجھنے میں مدد ملے گی، بلکہ اصولِ فقہ میں ایسے مباحث بھی موجود ہیں جو اُن مسائل پر بہتر روشنی ڈال سکیں گے، جو آج کے علوم کو درپیش ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دوسری ثقافتوں میں اصولِ فقہ قسم کا علم موجود نہیں رہا جو معاشرے کی اندرونی فکری ضرورت کی پیداوار ہو اور یہ کہ وہ مسلسل زندہ اور تازہ مسائل پر فلسفیانہ انداز سے غور و فکر کا تقاضا کرتا رہا ہو۔

تحقیقاتِ اسلامی میں اصولِ فقہ کی اہمیت کا چوتھا پہلو یہی ہے کہ یہ اسلامی فکر کا آئینہ دار ہے، اس لحاظ سے ہماری فکری تاریخ کی دستاویز ہے۔ اسلامی تہذیب نے جتنی مختلف النوع ثقافتوں، زبانوں، نسلوں، علاقوں اور لوگوں کو اپنے اندر سمویا ہے، اس کی شاید دوسری مثال موجود نہیں ہے۔ یہ ارتباط بذاتِ خود بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن اسلامی تہذیب نے جہاں ان کی انفرادیت کو پنپنے کا موقع دیا وہاں ان کو ایک وحدت کے رشتہ میں بھی پرو دیا ہے۔ اور یہ اسلامی تہذیب کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کی مخالفین نے بھی داد دی ہے۔ جن علما نے اس مسئلے پر گفتگو کی ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس وحدت کی بنیاد شریعت تھی۔ یعنی مسلمان خواہ کسی بھی علاقے، زبان یا رنگ و نسل سے وابستہ ہوتے جو بات ان سب کو ایک رشتے میں منسلک کیے ہوئے تھی، وہ مشترک شریعت تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ مختلف رسوم و رواج اور عادات کے لوگوں کو ایک ہی قانون مہیا کرنا کتنا مشکل اور دشوار کام ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ سارے مسلمانوں پر ایک ہی قسم کے ضابطے عائد تھے، اور ان کے مقامی رسوم و رواج کو ختم کر دیا گیا تھا۔ بلکہ وحدت کا مفہوم دراصل یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ ان کے مقامی رسوم و رواج، اختلافِ عادات اور مختلف فقہی مسالک وغیرہ کے باوجود ان کے لیے شریعت کے رہنما اور بنیادی اصول ایک تھے۔ ان اصولوں کے تعین اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا سہرا اصولِ فقہ کے سر تھا۔ یہ سوال کہ مقامی رسوم و رواج کو کس حد تک قانونِ اسلامی میں جگہ دی جائے اور ان میں کون سے رسوم اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہیں اور کون سے نہیں، یہ اور اس طرح کے دیگر کئی سوالات کا جواب اصولِ فقہ کا علم ہی دے سکتا تھا۔ اصولِ فقہ کا مطالعہ اگر اس پس منظر میں کیا جائے اور اس کا اس عہد کے تاریخی واقعات سے تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس دور کے فکری رجحانات کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ اور اس لحاظ سے اصولِ فقہ بہت اہم ماخذ ثابت ہوگا۔ اصولِ فقہ کی کتب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کے مباحث کا طرز اور ڈھانچہ ان ادوار میں قطعاً مختلف ہوتا ہے جن میں اسلامی معاشرے بنیادی تبدیلیوں سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ساتویں اور چھٹی صدی ہجری کی عز الدین ابن عبدالسلام السلمی کی قواعد الاحکام فی مصلحۃ الانام، ابو اسحاق شاطبی کی الموافقات اور ابن تیمیہ کی کتابیں اصولِ فقہ کی متداول کتابوں سے اپنے مباحث اور طرزِ تدوین میں قطعی مختلف ہیں۔ آپ اس دور کی تاریخ کو سامنے رکھیں تو ہماری اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اسلامی معاشرہ اس وقت بہت بڑی تبدیلیوں سے دوچار تھا۔

مختصراً یہ کہ تحقیقاتِ اسلامی میں اصولِ فقہ کی اہمیت دو طرح کی ہے۔ ایک ضمنی ہے اور دوسری بطورِ منہجِ تحقیق۔ اس کی افادیت اور ضرورت آج کل اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اسلامی معاشرہ جس طرح گوناگوں تغیرات سے دوچار ہے اور جس طرح مختلف النوع مسائل روز بروز سامنے آ رہے ہیں، اگر ہم ان کا حل اسلام میں تلاش کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے اصولِ فقہ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ باہر بھی جہاں اسلامک اسٹڈیز کو یونیورسٹی ڈسپلن کے طور پر پڑھایا جاتا ہے اس ضرورت کا احساس شدت سے کیا جا رہا ہے کہ دوسرے مضامین اور ڈسپلنوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کس طرح اسلامیات کا منہجِ تحقیق ابھی تک نہیں بن سکا ہے۔ ہمارے خیال میں ماضی میں بھی اصولِ فقہ نے اسلامی علوم کے لیے منہجِ تحقیق مہیا کیا تھا۔ اور آج بھی ہمیں یہیں سے راہنمائی مل سکتی ہے۔ اسلامیات کے مختلف اداروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کی طرف توجہ دیں۔

اب تک اس مسئلے کی طرف توجہ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خود اسلامیات کا مضمون، جو جدید نصابِ تعلیم میں قدیم مدارس کے نصاب کے نعم البدل کی حیثیت رکھتا ہے، ابھی تشکیل کے مراحل سے گذر رہا ہے۔ قدیم سے جدید تک آنے کا سفر خاصا دشوار بھی ہوتا ہے اور طویل بھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ سفر جاری ہے۔ پاک و ہند میں اس سفر کا آغاز اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد سے ہوا جب اس وقت کے معاشرتی اور علمی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا نظام الدینؒ نے مدارس کے لیے نیا نصاب تجویز کیا تھا، جو بعد میں درسِ نظامی کے نام سے معروف رہا۔ اگرچہ معاشرتی تقاضے بدلتے رہے، لیکن اس نظام میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی۔ پاک و ہند میں یورپی علوم اور یورپی تعلیم آنے کے بعد سے قدیم اور جدید میں تفریق بہت نمایاں ہو گئی۔ دارالعلوم دیوبند کا نصاب درسِ نظامی کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ علامہ شبلی نے بھی نصاب میں تبدیلیوں کی ضرورت پر زور دیا۔ یہ ابھی تک مدارس کے نصاب تک محدود تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جدید نصابِ تعلیم میں بھی اسلامی علوم کو شامل کیا گیا اور اس کی تدریس اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے درجے تک ہو گئی۔ اس میں بے شمار دقتیں بھی پیش آئیں۔ اس ضمن میں غالباً سب سے پہلی کوشش پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ علومِ اسلامیہ کا قیام ہے۔ یہ تمام کوششیں اس مضمون کی الگ حیثیت تسلیم کرنے کے لیے ہوتی رہی ہیں اور ابھی اس بات کا موقع نہیں مل سکا ہے کہ اس مضمون کی تعریف، تحدید اور طریقِ تحقیق وغیرہ کے بارے میں کوئی باقاعدہ نظام طے کیا جائے۔ اب ضروری ہے کہ پاکستان کی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں سے متعلق ایسے تمام اساتذہ اور علماء کے اجلاس بلائے جائیں جو علومِ اسلامی کے لیے ایک مشترک ادرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باضابطہ منہج تحقیق کا تعین کریں۔ یہ بات نہ صرف علومِ اسلامی کی تدریس اور موضوعات کی تحدید کے لیے مفید ہوگی بلکہ اسلامی معاشرت کے تقاضوں کے پیشِ نظر مختلف تحقیقات میں بھی ہم آہنگی اور مقصدیت پیدا کرے گی۔

یورپ میں بعض علما نے حال ہی میں اس مسئلے کی طرف توجہ دی ہے۔ یونیسکو کے تعاون سے ایک مجلہ نے خصوصی شمارہ انہی مسائل پر شائع کیا ہے۔ ان مقالات میں منہجِ تحقیق کا سوال بھی اٹھایا گیا ہے۔ لیکن کیا اس مسئلے میں بھی ہم یورپ کی پہل کے منتظر رہیں گے؟ کیا اس بحث و تحقیق کی ابتدا ہمارے ہاں سے نہیں ہو سکتی؟

فقہائے ہند (جلد اوّل)

از:۔ محمد اسحاق بھٹی

یہ کتاب پہلی صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک کے فقہائے ہند کے حالات پر مشتمل ہے اور اس دور میں برّصغیر پاک و ہند کے مختلف محدثین و فقہا نے جو علمی کوششیں کیں، ان کا یہ بہترین مرقع ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس خطۂ ارض میں اسلام کب آیا اور کس طرح اس نے یہاں کے باشندوں کو اپنی آغوشِ رحمت میں لیا۔ نیز تاریخی شواہد سے واضح کیا گیا ہے کہ سرزمینِ پاک و ہند میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے صحابی تشریف لائے۔ کس کس دَور میں آئے اور ان کے اسمائے گرامی کیا تھے۔ کن کن تابعین نے یہاں قدم رنجہ فرمایا، کون کون تبع تابعین آئے اور انھوں نے کیا خدمات انجام دیں۔ پھر کس کس علاقے میں محدثین کرام اور فقہائے عظام نے اپنی بساطِ علم بچھائی۔ اس دور کے سلاطین ملوک اور علمائے کرام کے درمیان جو ربط و تعلق تھا، اس کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ اردو میں یہ اپنی نوعیت کی واحد تصنیف ہے۔

حصہ اول : صفحات : ۲۰+ ۳۲۸ ، قیمت : ۱۳/۷۵

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ ، کلب روڈ ۔ لاہور

© rasailojaraid.com